

باب دوم

فکرِ مغرب کی اساس

اور اس کا تاریخی پس منظر

از
پروفیسر یوسف سلیم چشتی
مرحوم

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کا مندرجہ ذیل مضمون بظاہر تو ایک خط ہے جو موصوف نے راقم الحروف کے اس مضمون کی تحسین اور تائید کے لیے لکھا تھا جو جون ۱۹۶۷ء کے 'مِثاق' میں تذکرہ تبصرہ کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا لیکن اس نے یورپ کے فلسفہ و فکر کے تاریخی ارتقاء کے موضوع پر ایک جامع اور مبسوط مقالے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہاء اختصار اور تبصرہ کمال جامعیت کے امتزاج کے اعتبار سے یہ تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ کاش کہ پروفیسر صاحب کی بعض دوسری ناگزیر ضروریات نے موصوف کو مہلت دی ہوتی اور وہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھ سکتے تو فلسفہ جدید کے طالب علموں کی رہنمائی کا ایک مستقل سامان ہو جاتا۔ بحالت موجودہ بھی یہیں لکھنا ہے کہ یہ تحریر فلسفہ جدید کے بہت سے طالب علموں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

پروفیسر صاحب کی یہ تحریر بھی 'اولا' 'مِثاق' کی دسمبر ۱۹۶۷ء اور جنوری ۱۹۶۸ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ دارالاشاعت الاسلامیہ کے تحت "اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا عمل" کے عنوان سے شائع ہوا تو پروفیسر صاحب کی اس تحریر کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبد الماجد دریا آبادی مرحوم و مغفور نے 'صدق جدید' کی اشاعت بابت، فروری ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمایا تھا۔

"دونوں مقالے ماہنامہ 'مِثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں۔ دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے، دونوں فکر انگیز ہیں۔ اور ایک طرف جوش و خلاص اور دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔"

خاکسار

اسرار احمد

برادرِ عزیزِ اسلام علیکم درحمتہ اللہ وبرکاتہ

میتاق ماہِ جون ۱۳۷۲ء میں جو خیالات آپ نے تحت ”تذکرہ و تبصرہ“ سپردِ قلم کیے ہیں لڑکھ کر خوشی بھی ہوئی اور آپ کے لیے تر دل سے دُعا بھی نکلی۔ آپ نے عصرِ حاضر پر بصرہ کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اہل مغرب کا ملحدانہ زاویہ نگاہ، اس زاویہ نگاہ کا اہل مشرق کے ہنوں پر تسلط، اس کے مُضر نتائج، اس ناگوار صورتِ حال سے ربانی کی تجویز اور اصلاحِ حال براہ۔ ان مباحث پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بلاشبہ آپ کی اصابتِ فکر و رائے، معاملہ فہمی، بین نگاہی اور حقائقِ رسی کا واضح ثبوت ہے۔ میں آپ کو صدقِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فی آپ کو حوائج میں لڑکھوں کی سی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کسی خدمت کے لیے آپ کو منتخب کر لیا ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق بھی عطا فرمائے۔

میں نے بھی نصفِ صدی تک (از ۱۹۱۷ء تا ۱۹۴۷ء) انہی دو تین مسائل پر غور کیا ہے۔ یعنی مغرب میں الحاد اور مادیت کے فروغ کے اسباب، ان مغربی افکار کا اقوامِ مشرق کے ہنوں پر تسلط اور اس تسلط سے ربانی کی صورت۔ مجھے آپ کا مضمون پڑھ کر جو غیر معمولی مسرت حاصل ہوئی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میرے نتائجِ افکار اور آپ کے نتائجِ افکار میں میرٹ انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔ میری رائے میں آپ کی خدمت میں ہدیہ تحسین پیش کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ میں آپ کے بعض دعاوی کو مبرہن اور مدلل کر دوں، بعض حقائق کی وضاحت کر دوں بعض صداقتوں کو نوکد کر دوں اور بعض تجاویز کو مشید کر دوں۔

آپ نے لکھا ہے:

”موجودہ دورِ بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتداء

SANTAYANA	جس کا سب سے پرہیز حامی وکیل ہے	NATURALISM	(د)
J. S. MILL	" " " "	AGNOSTICISM AND SCEPTICISM	(ه)
LOYD MORGAN	" " " "	EMERGENT EVOLUTION	(و)
MORRIS COHEN	" " " "	ATHEISM	(ز)
SCHILLER	" " " "	HUMANISM	(ح)
MOORE	" " " "	REALISM	(ط)
DEWY	" " " "	PRAGMATISM	(ی)
CARNAP	" " " "	LOGICAL EMPIRICISM	(ک)
JEAN P. SARTRE	" " " "	EXISTENTIALISM	(ل)
FREUD	" " " "	FREUDISM	(م)
ADLER	" " " "	BEHAVIOURISM	(ن)
LENIN	" " " "	COMMUNISM	(س)
LASKI	" " " "	SOCIALISM	(ع)
RUSSELL	" " " "	LOGICAL ATOMISM	(ف)
SELLARS	" " " "	PHYSICAL REALISM	(ص)

ان تمام مدارس فکری میں قدر مشترک یہ ہے کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو اس کے وجود پر یقین کرنا سراسر حماقت ہے۔ چونکہ خدا، رُوح اور حیات بعد الموت تینوں غیر محسوس ہیں اس لیے ان کی سستی پر یقین خلافِ عمل ہے بلکہ یہ تینوں الفاظ مہمل ہیں کیونکہ ان کے مصادیق خارج میں کہیں موجود نہیں ہیں۔

یورپ میں لاندہ بنیدیت اور انکارِ خدا کے اسباب کی داستان بہت طویل ہے جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو انہیں حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے :-

1. CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE
By DR. DRAPER.

2. HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE By DR. DRAPER.
3. HISTORY OF THE WARFARE BETWEEN SCIENCE AND THEOLOGY By WHITE
4. HISTORY OF EUROPEAN MORALS By DR. LECKY
5. HISTORY OF FREE THOUGHT IN EUROPE By ROBERTSON

تاہم قارئین کی خاطر ذیل میں اجمالی طور پر کچھ اشارات درج کیے دیتا ہوں۔

(ا) جب JUSTINIAN قیصر روم نے یہ دیکھا کہ حکمائے یونان نصرانیت کے خلاف عقل عقائد پر فلسفیانہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں تو اس نے تنگ آکر ۵۲۹ء میں اپنی قلمرو میں فلسفہ اور حکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا اور تمام فلاسفہ اور حکماء کو جلاوطن کر دیا۔

(ب) اغیار کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد نصرانیوں کی زبان بندی اور ذہنی غلامی کے لیے کلیسائے روم کے اساقف اعظم (POPES) نے یہ قانون نافذ کیا کہ جو عیسائی کسی مذہبی عقیدے یا کسی کلیسائی فرمان پر اعتراض کرے گا، اسے کلیسا سے بھی خارج کر دیا جائے گا اور ملعون قرار دے دیا جائے گا۔ یعنی جیسے جی اچھوت اور بعد وفات اس کا لاشہ بے گور و کفن!

(ج) اجانب اور اقارب دونوں کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد کلیسائے روم کے خلاف عقل عقائد (DOGMAS) کے ساتھ حسب ذیل احکام واجب الادعا بھی نافذ کر دیئے۔

۱۔ معیارِ حق و باطل بائبل نہیں ہے بلکہ کلیسا ہے اور کلیسا سے مراد ہے پوپ اور اس کے

لے مثلاً (۱) تثلیث جس کی رُو سے خدا بیک وقت و بیک جہت (بانی آگلے صفحے پچھنے)

ما تحت مذہبی پیشواؤں کی جماعت۔

۲۔ ہر پوپ معصوم عن الخطا اور مطاع ہے اس لیے اس کے احکام میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ مذہب اور مذہبی عقائد میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے۔

بجا کہے جسے پایا، اسے بجا سمجھو
زبانِ پوپ کو نقارہ خدا سمجھو!

۴۔ کلیسائی روایات کا انکار بھی کفر ہے۔

۵۔ پوپ اور کلیسا کو گناہ معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۶۔ کلیسا کے علاوہ کسی شخص کو بائبل لکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(۵) تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اُنڈلس کے مشہور فلسفی ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء)

کلیسا کے عقائد کا تعلق لاطینی زبان میں ہو گیا اور پندرہویں صدی میں اس کی تمام

دو بیک حیثیت و بیک اعتبار ایک بھی ہے اور تین بھی ہے نیز وحدت بھی حقیقی ہے و تثلیث بھی حقیقی ہے۔

(ب) تجسم جس کی رُو سے کلام (LOGOS) جو خدا کے ساتھ بھی ہے اور خدا بھی ہے مجسم ہو کر یسوع کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(ج) یسوع نے اگرچہ وہ خدا تھا اور خدا کی صورت میں تھا، بوجہ غایت فروتنی (HUMILITY) اپنے آپ کو الوہیت سے معرّی کر دیا اور غلام کی حیثیت اختیار کر لی اور صلیبی موت گوارا کر لی۔

(د) یسوع مسیح نے مصلوب ہو کر قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے پیدائشی گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

(ه) جب پادری، عشاءِ ربانی کے وقت روٹی اور شراب پر یسوع کا نام لے کر دعا کرتا ہے اور اسے

اپنے ہاتھ سے تبرک کر دیتا ہے تو وہ روٹی یسوع کا جسم اور شراب، یسوع کا خون بن جاتی

ہے۔ اس ناقابلِ فہم عمل کو اصطلاح میں (TRANSUBSTANTIATION) کہتے ہیں۔ اُردو

میں اس کا ترجمہ ہوگا استعمالِ جوہری یا انقلابِ ذات۔

تصانیف اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہو گئیں۔ ان تصانیف کی بدولت یورپ ایک ہزار سال کے بعد ارسطو کے فلسفے سے واقف ہوا اور اس کی وجہ سے یورپ میں سولہویں صدی میں دو تحریکیں رونما ہوئیں جن کا نام ”احیاء العلوم“ اور ”اصلاح کلیسا“ ہے۔ چنانچہ رومن کیتھولک کلیسا، جس کے خلاف لوتھر نے صدائے احتجاج بلند کی اس بات کی معترف ہے کہ لوتھر بڑی حد تک ابن رشد کے فلسفے سے متاثر ہوا تھا۔ میری تحقیق بھی یہی ہے کہ لوتھر کے دماغ میں کلیسا کی اصلاح کا خیال ابن رشد کی تصانیف کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔

قصہ مختصر سولہویں صدی میں حسب ذیل پادریوں نے جو رومی کلیسا سے وابستہ تھے، کلیسا کی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی: ERASMUS م ۱۵۳۶ء ZIVINCLIM م ۱۵۳۱ء کیچرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا کہ بائبل کی صداقت کا دار و مدار کلیسا پر نہیں ہے (جیسا کہ کلیسا کہتی تھی)، بلکہ خود کلیسا کی صداقت کا دار و مدار بائبل پر ہے یعنی معیارِ حق و صداقت بائبل ہے نہ کہ پوپ یا کلیسا۔

لوتھر اور اس کے ہمنواؤں کے احتجاج (PROTEST) کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومن کیتھولک مذہب کے مقابلے میں یورپ میں پرائسٹنٹ مذہب پیدا ہو گیا اور کلیسا کا اقتدار بڑی حد تک ختم ہو گیا۔

تحریک احیاء العلوم کی بدولت یورپ میں فلسفے (خصوصاً فلسفہ ارسطو) کے مطالعے کا ذوق از سر نو زندہ ہو گیا اور جب اس کی بدولت یورپ کو عقلی آزادی نصیب ہوئی تو سترھویں صدی میں سائنس کا دور شروع ہوا جو آج کل بیسویں صدی میں اپنے نقطہٴ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔

(۵) اہل سائنس اور اہل فلسفہ دونوں نے کلیسائیت اور نصرانیت کے خلاف عقل عقائد پر اعتراضات وارد کیے۔ کلیسا اور نصرانیت دونوں ان کے جوابات سے قاصر اور عاجز تھیں۔ اس لیے انہوں نے معترضین کو کلیسا اور مذہب دونوں سے خارج کر دیا۔

کلیسا سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سائنس کی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار

دے دیا مثلاً جب کاپر ٹیکس اور گلیلیو نے یہ کہا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے تو کلیسا نے کہا یہ باتیں مذہب کے خلاف ہیں اور ان کے قائلین کا فرہیں۔

(۹) کلیسا کی عقل دشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنس اور مذہب میں جنگ شروع ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکماء اور فلاسفہ نے مذہب کو خیر باد کہہ دیا اور اس طرح یورپ میں لاد مذہبیت کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارہویں صدی کے نصفِ اول میں (HUME) نے لا اوریت کا فلسفہ پیش کیا اور عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ عقل انسانی، خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔ ہیوم کے اس فلسفے کو کانٹ (KANT) نے ۱۷۸۱ء میں پایہ تکمیل تک پہنچا دیا اور اپنی شہرہ آفاق تصنیف "تنقیدِ عقلِ خالص" میں خدا کی ہستی پر جو دلائل فلاسفہ نے مدون کیے تھے، ان سب کا ابطال کر دیا، اور اس طرح حکماء کی راہ ہموار ہو گئی۔

انیسویں صدی میں مشہور منطقی سرولیم ہیلٹن اور مشہور عالمِ الٰہیات ڈاکٹر مینسل نے ہیوم اور کانٹ کے نظریات کی یہ کہہ کر مزید تائید کر دی کہ ذہن انسانی خدا کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ ان کے بعد مل اور اسپنسر نے اپنے فلسفہ لا اوریت سے مذکورہ بالا حکماء کے نظریات کو تقویت پہنچائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکارِ خدا کا عقیدہ خواص اور عوام دونوں کے دماغوں میں جا گزیر ہو گیا۔

جب یورپ کو کلیسا اور پوپ کی غلامی سے نجات ملی تو حکماء اور فلاسفہ نے نفسِ مذہب کے ساتھ ساتھ نصرانیت اور کلیسا کی عقائد کو بھی ہدفِ تنقید بنایا اور انیسویں صدی میں ان کی تنقید اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس صدی کے نصفِ اول میں مشہور جرمن فاضل اور محقق اسٹراس (STRAUSS-1808-1874) نے ۱۸۳۵ء میں حیاتِ یسوع (LEBAN JESU) لکھ کر کلیسا کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا۔ اس غیر فانی کتاب میں اس نے اس بات کو سبب بن کر یسوع کی شخصیت تاریخی طور پر ثابت نہیں ہو سکتی نیز یہ کہ یسوع تو قدیم دیوتا مہتر کا مشقی ہے اور جو مذہب اس کے نام سے منسوب ہے وہ مہترانیت کا چرہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر واکر پروفیسر تاریخِ کلیسا نے اپنی تصنیف تاریخِ کلیسا میں اس

کتاب کو THE MOST EPOCH MAKING BOOK (عظیم ترین عہد آفریں کتاب قرار دیا ہے۔
 ۱۸۴۱ء میں ہیگل کے مشہور شاگرد فیورباخ (۱۸۰۴ء) نے اپنی مشہور آفاق کتاب
 "THE ESSENCE OF CHRISTIANITY" شائع کی جس میں اس نے عیسائی مذہب اور اس کے
 تصورِ ذاتِ باری دونوں کا ابطال کر دیا۔

۱۸۶۳ء میں منرینچ فاضل ارنسٹ رینان (۱۸۹۲ء) نے حیاتِ یسوع
 (VIE DE JESUS) لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کیا کہ یسوع محض ایک انسان تھا۔

پروفیسر لوبر (F. C. BAUR) نے بائبل کی کتابوں پر تنقید کی اور ثابت کیا کہ پولوس کے
 خطوط میں سے صرف تین اصلی ہیں باقی سب جعلی ہیں اس لیے بائبل بحیثیت مجموعی قابلِ اعتماد
 نہیں ہے۔

میں نے جو حرفِ طوالت چند نقادوں کے تذکرے پر لکھا کیا ہے۔ میرا مقصد یہ دکھانا ہے
 کہ اس تنقید کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پہلے مذہب عیسوی اور اس کے بعد نفس مذہب بھی پائے اعتبار
 سے ساقط ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کو اس بات سے بھی بہت ضعف پہنچا، کہ
 یورپ میں جو فلسفہ — اور اس سے میری مراد فلسفہِ تصورات (IDEALISM) ہے
 مذہب کا حامی تھا، انیسویں صدی میں اس پر چاروں طرف سے اعتراضات شروع ہو گئے
 اور اس کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفہ کے میدان میں مذہب کا کوئی مددگار باقی نہ رہا۔ اس کی
 تفصیل یہ ہے :-

انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اپنے فلسفہِ اشتراکیت کو مسلکِ مادیت کی اساس پر
 قائم کیا جو خدا اور روح دونوں کا منکر ہے۔

ڈارون نے نظریہ ارتقاء پیش کیا جس سے مسلکِ مادیت کو تقویت حاصل ہوئی، شوپن ہاور
 نے نظریہ قنوطیت (PESSIMISM) کی اشاعت کی اور یہ نظریہ بھی خدا اور مذہب کا
 مخالف ہے۔

مٹی اور اسپنسر نے مسلکِ لا اوریت کی تبلیغ کی اور یہ مسلک بھی مذہب اور خدا کے
 بارے میں شکوک پیدا کرتا ہے۔

نقطہ (NEITZCHE) نے بھی اپنے فلسفے میں خدا کا انکار کیا اور 'ANTI CHRIST' لکھ کر عیسائیت پر کاری ضرب لگائی۔

بیسویں صدی میں وجودیت (EXISTENTIALISM) اور منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) نے مادیت کو تقویت پہنچائی اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں آج یورپ میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ جس کی رُو سے خدا، رُوح اور آخرت تینوں الفاظ قطعاً بھل اور بے معنی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بریڈے (م ۱۹۲۷ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "مظاہر اور حقیقت" "APPEARANCE & REALITY" میں مادیت کی پورے طور سے تردید کر دی ہے۔

پنچاچڑا کٹر لیٹڈل نے اپنی تصنیف "فلسفہ اور مذہب" میں میرے قول کی بایں الفاظ تائید کی ہے: "مادیت کے بلکہ انی البواب میں مادیت کے مقابلے میں تصویریت کی جس انداز سے حمایت کی ہے اس کی تردید نہیں ہو سکتی۔" (ص ۲۷) لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ عصر حاضر میں الحاد پرور سنس اور ملحدانہ مدارس فلسفہ کو جو قبول عام کی سند حاصل ہو گئی ہے اس کی وجہ سے فلسفہ تصویریت جو مادے کے مقابلے میں رُوح کو اصل کائنات اور حقیقتِ اقصیٰ قرار دیتا ہے، غیر مقبول ہو چکا ہے۔ آج کی دنیا میں حکماء اور فلاسفہ کی اکثریت کامیلان مادیت کی طرف ہے اور مذہب کی اپیل بہت کمزور ہو گئی ہے اور سائنٹیفک نظریات نے بہت سے مذاہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔

عصر حاضر میں پانچ مدارس فکر بہت مقبول ہیں۔ اور سب کے سب الحاد پرور ہیں۔ اور انکا خدا و رُوح پر مبنی ہیں یعنی:-

1. PLURALISTIC REALISM.
2. DIALECTICAL MATERIALISM.
3. EXISTENTIALISM.
4. NATURALISM.
5. LOGICAL POSITIVISM.

اور ان میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔

خلاصہ کلام یارِ حجامِ عصر حاضر | قصہ مختصر خدا اور مذہب کے بارے میں جو شکوک اور شبہات جدید تعلیم یافتہ طبقے کے افراد میں پائے

جاتے ہیں، ان کے اسباب یہ ہیں:-

(ا) سائنٹیفک اسپرٹ (روح) کی روز افزوں نشوونما اور آبیاری۔

(ب) نیچرلائزیشن تہذیب کی ترقی۔

(ج) مادی علوم و فنون کا عروج۔

(د) ایجادات کی بدولت تسخیر عناصر کائنات کا سلسلہ۔

(ه) لذت جسمانی اور ترغیبات جنسی کی روز افزوں فراوانی اور بوقلمبی۔

ان عناصر سے انسان کا نقطہ نظر سراسر مادی ہو گیا ہے اور اس کا اثر حیات کے ہر شعبے پر مرتب ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی فتوحات نے انسان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے

خدا سے بے نیازی کی ابتداء تو کاپرنیکس ہی کے عہد سے شروع ہو چکی تھی اسی لیے

لاپلاس (LAPLACE) (م ۱۸۲۷ء) نے نیوٹن کے سوال کے جواب میں یہ عہد آفریں جواب

دیا تھا کہ ”میں نے اپنی تصنیف ’توضیح نظام کائنات‘ میں خدا کا ذکر محض اس لیے نہیں کیا

کہ عقل کی مدد سے کائنات کا نظام خدا کے بغیر بھی مدون ہو سکتا ہے۔“ اور اسی لیے بیسویں

صدی میں اقبال کے استاد میک ٹیگرٹ (م ۱۹۲۵ء) نے جب اپنا فلسفہ خودی

”ONTOLOGICAL IDEALISM“ کے عمیر الغنم عنوان سے مرتب کیا تو انسانی خودی کو حقیقت

(REALITY) تسلیم کرنے کے بعد خدا کو اپنے نظامِ فکر سے بکلی خارج کر دیا۔

فزیکل سائنس ہر لمحے ہماری حیاتِ اجتماعی و انفرادی کو متاثر کرتا رہے خصوصاً ہمارے

۱۔ نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی یہ صنایع بھر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (اقبال)

۲۔ اقبال نے ۱۹۳۵ء میں اپنے استاد کے سوانح حیات پڑھ کر اس کی یاد میں ایک مختصر مضمون لکھا تھا اور

اس کے آغاز میں اسے PHILOSOPHER SAINT ”فلسفی ولی“ کے لقب سے نوازا تھا۔

مدارسِ فلسفہ ہمارے مذاہب اور حیات و ممات سے متعلق ہمارے عمومی زاویہ نگاہ پر تو نمایاں اور قابلِ تردید اثر مرتب ہوا ہے۔

جدید سائنس کی رو سے حیاتِ عضوی کی توجیہ محسوس فطری قوانین کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اس کے لیے کسی فوق الفطرت طاقت کا سہارا نہیں لیا جاتا اور اس سائنٹیفک توجیہ کی رو سے انسان فاعلِ مختار (FREE MORAL AGENT) نہیں ہے۔

اسی طرح جدید نفسیات کی رو سے انسان اپنی ذات کا مالک نہیں ہے۔ نفس انسانی کی باشعور زندگی پر اس کی حیوانی جبلتوں کی حکومت ہے جو اس کے لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ فرائڈ یہ بھی کہتا ہے کہ ارادہ و مشیت کی آزادی دراصل ایک خود پسندانہ فریبِ نفس ہے۔ انسانی شخصیت کا تعین خارجی ماحول سے ہوتا ہے۔ جیسا ماحول مل گیا ویسا ہی انسان بن گیا۔

فلسفہ اخلاق بھی سرسرامادی بنیادوں پر مبنی ہو گیا ہے۔ پروفیسر ڈیوی لکھتا ہے کہ ”اخلاقی اقدار بھی اُسی طرح غیر مستقل اور بے ثبات ہیں جس طرح بادل مستقل (ازلی) اقدار کا تصور محض خوش فہمی ہے۔“ رہے مسائلِ مابعد الطبیعات تو ان کے متعلق منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فتوہ لے رہے ہیں کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو وہ ناقابلِ التفات ہے۔

کائنات اور حیاتِ انسانی کے بارے میں سائنس اور فلسفہ مادیت کا قولِ فیصل یہ ہے کہ یہ دونوں بے مقصد ہیں۔ انسان کی تقدیر یہ ہے کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیے، افزائشِ نسل کرے اور آخر کار مرنے کا ہمیشہ کے لیے فنا (معدوم) ہو جائے۔ الغرض جدید سائنس اور فلسفے کی روح، مذہب کے خلاف ہے۔

یہ ہے مختصر طور پر آپ کے مضمون کے ابتدائی حصے کی توضیح۔ میں نے اختصار کو مد نظر رکھا ہے ورنہ یہ موضوع اس قدر وسیع الذیل ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ ”اس قسم کی کوشش کا منظر اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی نیز یہ کہ ”یہ امر واقعی ہے کہ اُن (سرسید) کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل گئی اور ماوہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا“ میں آپ کے اخذ کردہ نتائج

سے بالکل متفق ہوں۔ سرسید نے مذہب کے درخت میں مغربی فلسفے کا جو پیوند لگایا ہے، اس کے آثارِ تلخ سے پاکستانی مسلمانوں کے کام و دین بقدرِ ذوق خوب لذت اندوز ہو رہے ہیں۔ ’دقیانوسی‘ ٹائپ کے مسلمان ابھی سے اس تلخی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

پھر آپ نے لکھا ہے کہ ”ان تحریکوں کا مطالعہ اسلام اسی مغربی مادہ پرستانہ نقطہ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادے کو اور حیاتِ اُخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیت کہ انفس اور آفاق میں تنہا وہی فاعل مطلق، مفعول مطلق اور مفعولِ مفعول ہے۔ بالکل مفعول ہے۔۔۔ رسالت کا اقرار تو موجود ہے لیکن محبتِ رسول نام کو موجود نہیں ہے۔

میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کو اس حقائق رسی، ژرف نگاہی اور معرفت نگاری پر داد دیتا ہوں۔ سچی بات یہی ہے کہ جب تک ایک مسلمان ’اللہ تعالیٰ کو فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی نہ سمجھے‘ قرآنی توحید کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تصوف، جسے جاہل صوفیوں نے بدنام کر دیا، اصل توحید ہی کو دل و دماغ میں جاگزیں کرنے اور اسے زندگی میں ایک عاملِ مؤثر بنانے اور اس کے تقاضوں پر عمل کے لیے آمادہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ اپنی تصنیف ”فتوح الغیب“ کے تیسرے مقالے میں فرماتے ہیں کہ ”اے بیٹے اس بات کو ضررِ جاں بنالے کہ لا فاعل فی الحقیقۃ ولا مؤثر فی الحقیقۃ الا اللہ“

واسترا! آج شیخ موصوف کے نام پر گیارہویں کی

سلہ شیخ موصوفؒ ۱۳۸۷ھ میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں دینی علوم سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد بیس سال تک اپنے مرشد کے زیرِ تربیت رہ کر تزکیہٴ نفس کرتے رہے چالیس سال کی عمر میں مرشد کے حکم سے تلمیذ و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پچاس سال تک مسلمانوں کو توحید کا درس دیتے رہے اور طلبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہے ۱۳۸۷ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ رحمۃ ایزدی بروحش باد!

نیز کرنے والے تو لاکھوں میں مگر ان کی تعلیم پر عمل کرنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس بزرگ نے پچاس برس تک مسلمانوں کو یہ تلمیق کی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی دستگیر نہیں۔ کوئی مشکل کشا نہیں، کوئی حاجت روا نہیں، آج اس کے نام لیوا خود اسی کو دستگیر اور مشکل کشا سمجھتے ہیں اور اللہ کے بجائے اسی کو پکارتے ہیں۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو تاکہ ایمان زرعے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر حال کی صورت اختیار کر لے۔ میں اس باب میں آپ سے کچھ متفق ہوں۔ اقبال نے اسی بات کو یوں ظاہر کیا ہے

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل

دول و جمہال مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں ہمیں یہی انقلاب نظر آتا ہے کہ عقیدہ توحید ان کا حال بن گیا تھا اسی انقلاب کا یہ نتیجہ تھا کہ ”انہیں یہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی اور خیالی نظر آتی تھی لیکن ذات خداوندی ایک زندہ جاوید حقیقت معلوم ہوتی تھی۔ وہ جس طرف کو منہ کرتے تھے انہیں اللہ ہی نظر آتا تھا اور وہ ہر واقعے میں اللہ ہی کو کار فرما دیکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے ذیل کے شعر میں یہی انداز نگاہ پیدا کرنے کی تلمیق کی ہے:

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ

مطلب ہے کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

پھر آپ نے لکھا ہے کہ ”ایمان بالغیب کے لیے نقطہ نظر اور طرز فکر کی تبدیلی لازمی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے۔ لیکن ذات خداوندی ایک زندہ جاوید حقیقت معلوم ہو۔۔۔ حیات دنیوی فانی ہی نہیں بالکل غیر حقیقی اور بے وقعت معلوم ہو اور حیات اخروی حقیقی اور واقعی نظر آنے لگے جب تک اُمت کے ایک قابل ذکر حصے میں نقطہ نظر کی یہ تبدیلی رونما نہ ہو، احیاء اسلام کی آرزو ہرگز ہرگز شرمندہ تکمیل نہ ہو سکے گی۔“ میں آپ کی اس بات سے کچھ اتفاق کرتا ہوں بلکہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ آپ کو توفیق دے کہ آپ اس صداقت عظمیٰ کو پاکستان ہی نہیں

تمام دنیائے اسلام میں شائع کر سکیں اور ہر مسلمان تک پہنچا سکیں۔ میں پچاس برس کے غور و فکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچا، اللہ نے آپ کو دس پندرہ سال کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا دیا اور مزید کرم یہ کیا کہ اسے پیش کرنے کی سعادت بھی آپ کو عطا فرمائی۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تحریکیں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں برپا ہوئیں وہ سب میری نگاہوں کے سامنے ہیں اور میں نے اپنی آنکھوں سے ان تحریکوں کو نا کام ہوتے دیکھا ہے سبب اس ناکامی کا وہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے کہ جن لوگوں نے یہ تحریکیں برپا کیں ان میں بنیادی نقص یہ تھا کہ اللہ کے ساتھ ان کا تعلق محض قال تک محدود تھا بالفاظِ دگر وہ اسلام کا نام تو لیتے تھے، مگر اس کی روح سے بیگانہ تھے۔ اسلام کی روح، جیسا کہ میں سمجھا ہوں محض ارکانِ اسلام کی رسمی پابندی نہیں ہے بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھنا ہے کہ اللہ ہی کیسے نظر رہتا ہے، غیر اللہ کی ہستی کا عدم ہو جاتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے ”عوام کے قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین طریقہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب اور اذنان معرفتِ ربانی سے منور ہوں اور سینے کبر و حسد، بغض اور ریاء سے پاک ہوں اور زندگیاں حرص و طمع اور حُبِ دنیا سے خالی ہوں۔“

میں اس معاملے میں بھی آپ سے کبھی متفق ہوں، ازراہِ تفاعل نہیں بلکہ بطورِ اظہارِ حقیقت یہ بات لکھ رہا ہوں کہ میں نے پچاس سال سے زائد عرصہ منطق، فلسفہ، الہیات اور علمِ کلام کے مطالعے میں ضائع کیا لیکن خدا گواہ ہے کہ نہ تو ان علوم و فنون سے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا ہوا اور نہ کتابوں سے کبر و حسد، بغض و ریاء اور حرص و طمع کا ازالہ ہوا۔ ان امراضِ خبیثہ کا ازالہ تو کیا ہوتا تھا میرا دماغ شکوک و شبہات کی جولاں گاہ بن گیا اور اگر اس عالمِ پیری میں (سن ولادت ۱۳۱۷ھ) توفیقِ ایزدی تصوف کے نخلستان میں نہ پہنچا دیتی تو آج تشکیک کے رنجستان میں اعطشِ اعطش پکارتا ہوا شکر ہے کہ وفات سے پہلے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا

(اکبر)

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

سچ کہا ہے شیخ سعدیؒ نے:

جز بیاورد دست ہر چہ کی عمر ضائع ہست جز صرف عشق ہر چہ بخوانی بطلالت است
سعدی بٹورے نقشِ لوی رازِ لوحِ دل علمے کہ راہِ حق نہ نماید، جہالت است
نیز سچ کہا ہے مرشدِ رمیؒ نے:

علم چہ بود؟ آنکہ رہ بنمایدت زنگِ گمراہی ز دل بزدا یت
علم بنود غیرِ علم عاشقی مالبقی، تلبیسِ ابلیسِ شقی
یہ صحبت ہی کا تو ثمرہ تھا کہ ابنِ ابی قحافہ، صدیقِ اکبرؓ کے مقام پر فائز ہو گئے اور یہ صحبت ہی کا
تو کرشمہ تھا کہ ابنِ خطابؓ کو فاروقِ اعظمؓ کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ رضی اللہ عنہما۔ اسی لیے اقبالؒ نے یہ کہا:

صحبت از علم کتابی خوشتر است

صحبت مہمانِ حرم، آدمِ گر است

دیں محو اندر کتبِ اے بے خبر

علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

پھر آپؐ نے لکھا ہے کہ ”وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک
اٹھے جو تعلیم یافتہ طبقات اور زمینِ افرا میں انقلاب برپا کر دے یعنی انہیں خدا پرستی اور خود شناسی
کی دولت سے مالا مال کر دے۔۔۔ الخ“

میں آپؐ کی ان تجاویز سے کبھی متفق ہوں اور اس دُعا پر اس خط کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ آپؐ کو
عصرِ حاضر میں دعوت و تبلیغِ اسلام کی توفیق از رانی فرمائے اور یہ حقیقت آپؐ پر واضح کر دے کہ مقصدِ
حیاتِ استرضاءِ باری تعالیٰ ہے نہ کہ حصولِ حکومتِ ارضی حکومتِ یا خلافتِ ایمان و عملِ صالح کا ثمرہ
ہے نہ کہ مقصودِ بالذات شے۔ اور آپؐ سے استدعا ہے کہ آپؐ اس ننگِ خلافت کے خاتمہ بالخیر کی مُعاذرتیں

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا

اب فکرِ آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا (اکبرؒ)

والسلام خیر الختام

مجمعِ عیوب و زشتی یوسف سلیم چشتی